اور آدم بھُول گیا

نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

اور آدم بھول گیا

نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

نام کتاب : اور آدم بھول گیا

مُصنّفہ : نگہت ہاشمی

طبع اوّل : مئی 2006ء

تعداد : 2100

ناشر : النور انٹرنیشنل

فیصل آباد : 103 سعید کالونی نمبر 1' کینال روڈ' فون: 1851 872 - 041

بہاولپور : 7A' عزیز بھٹی روڈ' ماڈل ٹاؤن اے' فون: 2875199 - 062
2885199' فیکس : 2888245 - 062

ملتان : 888/G/1' بالمقابل پروفیسرز اکیڈمی' بوسن روڈ' گلگشت
فون: 8449 600 - 061

ای میل : alnoorint@hotmail.com

ویب سائٹ : www.alnoorpk.com

مطبع : عبدالرفیع پرنٹرز اینڈ پبلیشرز

قیمت : 20 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا[115] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط اَبٰى[116] فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى[117] اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى[118] وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى[119] فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى[120] فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ز وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى[121] ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى[122] قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًام بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى لا فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى[123] وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى[124] قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا[125] قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى[126] وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْم بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى[127] اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى[128] [سورہ طٰہٰ]

''ہم نے اس سے پہلے آدم علیہ السلام کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا۔ یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ 'دیکھو، یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے لیکن شیطان نے اس کو پھسلایا، کہنے لگا: 'آدم علیہ السلام! بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟' آخرِ کار دونوں (میاں بیوی) اس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی اُن کے ستر ایک دُوسرے کے آگے کھُل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنّت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم علیہ السلام نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے ربّ نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی اور فرمایا 'تم دونوں فریق (یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا اور جو میرے 'ذکر' (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں زندگی تنگ ہو گی اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: 'پروردگار! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: 'ہاں، اِسی طرح تو ہماری آیات کو جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تُو نے بھلا دیا تھا۔ اُسی طرح آج تُو بھُلایا جا رہا ہے۔'

اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے ربّ کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔ پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شُدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں۔''

آدم علیہ السلام کون ہے؟

وہ کہاں سے آیا؟

اس کو بنانے کا کیا مقصد ہے؟

کیا اس نے سدا اس زمین پر رہنا ہے یا واپس لوٹ جانا ہے؟

اگر واپس لوٹ جانا ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ آنے اور جانے کے درمیان جو زندگی ہے اس کے لیے اُس بھیجنے والے نے کیا مقصد متعین کیا؟

یہاں اسی کا تذکرہ ہمیں مل رہا ہے۔ ربّ العزت فرماتے ہیں:

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ

''ہم نے اس سے پہلے آدم علیہ السلام کو ایک حکم دیا تھا۔''

نوٹ کیجیے گا، ربّ العزت نے اپنی بات کی ہے کہ ''ہم نے حکم دیا تھا''، یعنی ہمارے اور آدم علیہ السلام کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا۔

فَنَسِیَ ''لیکن وہ بھول گیا۔''

اور بھولنے کی وجہ کیا تھی؟

وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا [115]

''ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔'' ارادے کا بڑا کمزور ہے۔

یہ عہد کون سا تھا؟ اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

عہد تھا یومِ الست کا، یہ وہ دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے نسلِ آدم علیہ السلام کو اُن کی پشت سے نکالا تھا اور ان سے یہ سوال کیا تھا کہ

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟''

کیا میں نے تمہیں بنایا نہیں؟

کیا میں تمہارا مالک نہیں؟

سب نے مشترکہ طور پر جواب دیا تھا:

بَلٰى ''کیوں نہیں؟'' [الاعراف:172]

کیونکہ اس وقت تک انسان کا ذہن غافل نہیں تھا، اس وقت تک کسی قسم کی اغراض کا پردہ اس کے ذہن پر نہیں پڑا تھا، وہ کھلی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ رہا تھا، آج جو کچھ پردۂ غیب میں ہے کل نہیں تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا، اس وقت وہ فرشتوں کو بھی دیکھ رہے تھے، جنّات کو بھی دیکھ رہے تھے، جنت کا مشاہدہ بھی کر رہے تھے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا بھی انھیں اتفاق ہوا تھا، جنتی لباس بھی پہنے تھے، جنت کی غذائیں بھی کھائی تھیں، جنت کے خوشبوں بھرے ماحول میں بھی رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ آدم علیہ السلام کی قوتیں اس وقت مختلف تھیں، جو قوت آج نسلِ آدم علیہ السلام کے اندر ہے، اس کے مقابلے میں پردۂ غیب کے پیچھے وہ حقیقتیں چھپی ہوئی نہیں تھیں، اس لیے اُس وقت

دیکھنا، سوچنا، سمجھنا، احساس کرنا اور شعور رکھنا بہت آسان تھا۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہمیں تو چونکہ اس معاہدے کے بارے میں یاد نہیں اس لیے خدا معلوم وہ ہوا بھی تھا یا نہیں؟ اصل بات تو یہ ہے، جب ربّ العزت نے کہہ دیا کہ معاہدہ ہوا تھا، جب مالکِ کائنات نے کہہ دیا کہ عہد کا معاملہ ہوا تھا تو ہم نے مان لیا، اب یاد ہو کہ نہ یاد ہو، ہم ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور ثبوت بھی تو ملتا ہے اس کا، خود انسان کی فطرت کے اندر دیکھیے:

انسان جب کوئی اچھا یا برا کام کرنا چاہتا ہے، ہر کام کرتے ہوئے ایک صَدا اندر سے ضرور اُبھرتی ہے، اچھا ہو تو اطمینان اور برا ہو تو خلجان، انسان اندر سے بُرا محسوس کرتا ہے، اس کے بارے میں شک میں پڑ جاتا ہے، اندر شبہ پیدا ہو جاتا ہے تو یہ جو اندر کی کھٹک ہے، یہ اسی معاہدے کا ثبوت ہے کیونکہ ربّ العزت نے انسان کو جب بنایا تو اس کی اچھائی اور برائی اس کو الہام کر دی، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ربّ العزت فرماتے ہیں:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا [الشمس:8]

''ہم نے انسان کو اس کی اچھائی اور برائی الہام کر دی۔''

اس کا مطلب ہے کہ ایک معاہدہ ہوا تھا، اگر ہمیں یاد نہیں ہے تو ہمیں تو اپنی پیدائش کا وقت بھی یاد نہیں ہے۔ اُس وقت جب ہم نے اردگرد کے ماحول کو دیکھا تھا تو کیا کیفیت تھی؟ پہلے روئے تھے، پھر ماں نے کیسے سنبھالا تھا؟ کچھ بھی تو یاد نہیں۔ ماہرینِ نفسیات [psychologists] کہتے ہیں کہ اٹھارہ ماہ کی عمر تک بچے کی شخصیت پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ لازوال ہوتے ہیں، یعنی وہ ختم نہیں ہوتے اور لازوال کی اصطلاح میں نے اس لیے استعمال کی ہے کہ انسان ابدی مخلوق ہے۔

آپ کہیں گے کہ ہم تو فنا ہو جانے والے ہیں، ہم کیسے ابدی ہیں؟

تو ابدی اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فنا کی منزل سے گزارنا تو ہے لیکن کچھ عرصے کے لیے، پھر جب دوبارہ زندگی ملے گی تو کبھی ختم نہیں ہوگی، دنیا میں جو زندگی ملی ہے اگر وہ وقتی طور پر قبض کر بھی لی جائے گی تو پھر دوبارہ واپس کر دی جائے گی۔ اس لیے انسان فانی ہونے کے باوجود ابدی مخلوق ہے کیونکہ اس نے مٹی میں مل کر ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جانا۔ آج تو سائنس بھی اس بات کو مان چکی ہے کہ ڈی این اے[DNA] ختم نہیں ہوتا اور ہمیں پتہ چل چکا کہ انسان جب ایک بار پیدا ہو جاتا ہے تو بالکل اسی طرح سے دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے، تحقیقات[researches] بالکل وہیں لے کر جا رہی ہیں، جیسے ایک سیل پر ہونے والی تحقیقات اب اس موڑ پر پہنچی ہیں کہ جس چیز کا وہ سیل ہے اس سے پوری کی پوری مخلوق grow کی جا سکتی ہے، اگر بھیڑ کا ایک سیل ہے تو پوری بھیڑ، اگر انسان کا سیل ہے تو پورا انسان۔ اگر ڈی این اے[DNA] ختم نہیں ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا، پورے کا پورا انسان اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا، یعنی دوبارہ زندگی مل جانی ہے اور ہم بحیثیت ایک مسلمان کے اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ جو ہمارے ربّ نے کہا ہے وہ بالکل سچی بات ہے اور عقل بھی اس چیز کا اعتراف کرتی ہے، اللہ ربّ العزت نے یہاں اسی کا تذکرہ کیا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا [115]

''ہم نے اس سے پہلے آدم علیہ السلام کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔''

یعنی ہم نے اس کے اندر ارادے کی کمی پائی۔ ہر انسان کے اندر جو بنیادی خرابی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح کر دیا۔ یہاں ہمیں دو خرابیوں سے آگاہ کیا جا رہا ہے:

1۔ بھول جانا۔

2۔ ارادے کی کمی۔

آج بھی دیکھیں ہم انسان ہونے کی حیثیت سے بھولتے ہیں، عام زندگی میں بھی دیکھیں ہم چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ کر بھول جاتے ہیں، کبھی کسی سے کوئی بات کہنا بھول جاتے ہیں، کوئی ہمیں کوئی بات کہے تو یاد نہیں رہتی اور اگر ہم دیکھنا چاہیں کہ کون کون سی چیزوں کو ہم بھولتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جن کو ہم یاد رکھنا نہیں چاہتے لیکن بعض اوقات ہم ایسی چیزیں بھی بھول جاتے ہیں جنھیں ہم یاد رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ یاد رہتی نہیں ہیں، ایک تو انسان کے اندر یہ خامی ہے کہ وہ بھولتا ہے اور دوسری خامی اس کے اندر ارادے کی کمزوری ہے یعنی ان دو چیزوں میں انسان مار کھاتا ہے۔ اگر ہم حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے حوالے سے دیکھیں تو ان میں بھی یہی کمی تھی۔ اب ہم ان دو باتوں کے حوالے سے پہلے تو یہ دیکھیں گے کہ

کیا انسان واقعی بھولتا ہے؟

اور کیا اس کے اندر واقعی ارادے کی کمزوری ہے؟

اور پھر یہ کہ ان دونوں کمزوریوں پر قابو کیسے پایا جائے؟ کیونکہ یہ کمزوریاں اگر اسی طرح سے رہیں تو پھر ہمارے لیے مشکلات رہیں گی۔

ربّ العزت نے فرمایا:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی[116]

فَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوْجِکَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ

الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی[117]

”اور یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ 'دیکھو، یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔“

یہاں دیکھیے، بنیادی بات تو اللہ تعالیٰ نے سمجھا دی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شیطان تمہیں جنت سے نکلوا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور آگاہی کس حوالے سے دی تھی؟ کہ تمہارا ایک دشمن ہے۔ دشمن دشمنی کرتا ہے اور اس کی دشمنی ہمیشہ جاری رہتی ہے، اس لیے شیطان کے بارے میں ربّ العزت نے آگاہ کیا:

فَلاَ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی[117] اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰی[118] وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰی[119] فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْکٍ لَّا يَبْلٰی[120] فَاَکَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ز وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی[121]

”کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے لیکن شیطان نے اس کو پھسلایا، کہنے لگا 'آدم علیہ السلام! بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟' آخرِ کار دونوں میاں بیوی اس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً

ہی ان کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم علیہ السلام نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔"

یہاں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ شیطان نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تو دو چیزوں کے بارے میں انہیں غلط فہمی میں مبتلا کیا۔ آج کی دنیا میں بھی اگر دیکھیں تو یہی دو چیزیں انسان کی بنیادی خواہشات میں سے ہیں:

1۔ ابدی زندگی

2۔ لازوال سلطنت

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا کہ انسان ابدی مخلوق ہے اور اگر ابدی مخلوق کو یہ پتہ چلے کہ کچھ عرصے کے لیے درمیان میں سو جانا ہے، یعنی اس زندگی نے ختم ہو جانا ہے اور پھر نئے سرے سے زندہ کیا جانا ہے، پھر ایک بار زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ فنا ہونا اس کے دل کو تکلیف دیتا ہے، اس کو عجیب طرح کے شبہات میں ڈالتا ہے اور انسان کا یہ خاصا ہے کہ جو چیز اسے پریشان [disturb] کرتی ہے وہ اس کا علاج ضرور کرنا چاہتا ہے اور اگر اسے کوئی مشورہ دے تو اس کو بھی بے دریغ قبول کر لیتا ہے، اس لیے کہ وہ نقصان میں پڑنا نہیں چاہتا، بس شرط یہ ہے کہ اسے نقصان کا پتہ چل جائے۔ شیطان نے بھی انسان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اسے ابدی زندگی کا جھانسہ دیا۔ اصل میں آدم علیہ السلام کو جب جنت میں بسایا گیا تھا تو اس وقت بھی انھیں پتہ تھا کہ ہمیں عارضی طور پر جنت میں بسایا جا رہا ہے،

پھر زمین پر جانا ہے۔

پھر فنا ہونا ہے۔

پھر اپنے اعمال کی جزا و سزا کو پانا ہے۔

پھر دوبارہ جنت میں آنا ہے۔

اس لیے دنیا میں رہتے ہوئے جنت میں جانے کی کوشش کرنی ہے۔

پھر اسی طرح سے دیکھا جائے تو دنیا میں کوئی بھی مشقت نہیں اٹھانا چاہتا۔ انسان یہی چاہتا ہے کہ اسے مشقت کے بغیر ہی ساری نعمتیں مل جائیں۔ شیطان نے اسے یہی جھانسہ دیا کہ آپ میری بات مان لو تو جنت سے نہیں نکالے جاؤ گے، مشقتوں سے بچ جاؤ گے۔

اللہ ربّ العزت نے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا لیکن شیطان نے انسان کو پھُسلا دیا، دراصل انسان قائل [convinced] ہو جاتا ہے، اُس کی عقل جھکتی ہے اور یہاں پر یہی بات بتائی جا رہی ہے کہ جس وقت انسان اونچا خواب دیکھتا ہے اور اس کو پانے کی کوشش کرتا ہے، تب اسے کوئی دھوکے میں مبتلا کرنا چاہے تو وہ دھوکہ کھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھا جائے تو دنیا میں بھی بہت سارے دھوکے انسانوں کو دیے جاتے ہیں اور انسان ان دھوکوں میں آ جاتے ہیں جیسے لاٹری سکیمز ہیں، انسان کو اگر یہ پتہ چلے کہ اچھا اگر فلاں پرائز بانڈ خرید لیا تو انعام نکل سکتا ہے تو وہ خرید لیتا ہے، اسی طرح اس کو اگر پتہ چلے کہ فلاں مد میں مال لگایا جائے تو اس سے اتنا منافع ہو جائے گا تو وہ منافع کی خاطر مال لگانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے چاہے بات سچی ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح سے انسان چھوٹی چھوٹی باتوں میں لالچ میں آتا ہے۔ ایک بچے کو دیکھیں آپ اسے چاکلیٹ کا لالچ دے سکتے ہیں، آئس کریم کا لالچ دے سکتے ہیں، بڑے ہوں تو لالچ بڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ لالچ انسان کی موت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

انسان خاص طور سے دو چیزوں کی حرص رکھتا ہے:

ایک تو یہ ہے کہ اسے ایسی زندگی مل جائے جو کبھی ختم نہ ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ

اسے لمبی عمر ملے، وہ کبھی موت کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔

دوسری چیز جو اس کو چاہیے وہ ہے لازوال سلطنت۔ اتنا سب کچھ جو کبھی ختم نہ ہو، ہمیشہ کی بادشاہت۔

دنیا کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو انسان کی ساری کوششیں اور کاوشیں کس لیے ہیں؟ صبح سے لے کر شام تک ایک مرد اگر محنت کرتا ہے تو کس وجہ سے؟ کہ دنیا کو جنت بنا لے، بن نہیں سکتی لیکن بنانے کی ایک کوشش ضرور ہے۔ اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے انسان کی جتنی کوششیں ہیں وہ اسی زُمرے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خاتون ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ تعاون [Cooperate] کرتی ہے، اگر شوہر باہر کے کام کرتا ہے تو وہ گھر کو جنت بنانے میں مصروف رہتی ہے، اپنے بچوں کو، اپنے ماحول کو اور خود اپنے آپ کو سنوار کر رکھنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ یہ کوشش زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ جو مال ملا ہے اس کو درست انداز میں [properly] استعمال کیا جائے، زیادہ سے زیادہ سہولت اور سکون والی زندگی گزاری جائے۔ اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ عیش و آرام اور سکون سے بھرپور زندگی انسان کی بنیادی خواہشات میں سے ہے اور انھیں وجوہات کی بناء پر انسان دنیا کی زندگی میں اپنا وقت بھی لگا تا ہے، قوتیں بھی اور صلاحیتیں بھی۔

تو ربّ العزت فرماتے ہیں کہ تمہارے سامنے آدمؑ اور حواؑ کی مثال موجود ہے، دیکھ لو، جان لو کہ شیطان نے انھیں کیسے بہکایا تھا، ان سے ربّ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروائی تھی۔ پھر فرمایا:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰی [122]

”پھراس کے ربّ نے اسے برگزیدہ کیااوراس کی توبہ قبول کرلی اوراسے ہدایت بخشی۔“

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر گناہ پر شرمندہ ہونے کی خصوصیت رکھی ہے یعنی اگر غلطی ہوجائے تو وہ نادم [guilty] ہوتا ہے، اس کو شدّت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ غلط کرلیا ہے، اندر سے Reaction ہوتا ہے اوراس کی وجہ سے وہ اپنے ربّ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام نے بھی رجوع کیا تھااورآج کے انسان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے کہ وہ رجوع کرنا چاہتا ہے تو ربّ العزت فرماتے ہیں کہ

فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى[122]
”پھراس کی توبہ قبول کرلی اوراسے ہدایت بخشی۔“

اس کا مطلب ہے کہ انسان کوتوبہ کے بعد جوتحفہ ملا وہ ہدایت کا تھا، رہنمائی کا تھا کہ چونکہ انسان کوخودبھی احساس ہوگیا ہے کہ وہ پھسل سکتا ہے، بہک سکتا ہے، لہٰذا اب اس کو ایک مکمل رہنمائی کے نظام [Guidance system] کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے وہ نہ بہکے، نہ بھٹکے، نہ بھولے، نہ گمراہ ہواورنہ راستہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کرم کیااور اسے ہدایت بخشی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا م بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى لا فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى[123]
”ربّ العزت نے فرمایا: تم دونوں فریق [یعنی انسان اورشیطان] یہاں سے اترجاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہوگے۔ اب اگرمیری طرف سے تمہیں

کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔“

دنیا کی زندگی میں دیکھیے لوگ مختلف[tests] کراتے ہیں اور اگر پتہ لگ جائے کہ اندر کسی بیماری کے جراثیم موجود ہیں اور اس کا علاج ہوسکتا ہے تو پھر ڈاکٹر جو بھی تجویز کرتا ہے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

مجھے ایک خاتون نے بتایا کہ جب ڈاکٹر نے ان کا آپریشن کرنا چاہا تو انھیں اس چیز کا شک ہوا کہ اندر کوئیgrowth موجود ہے تو انھوں نے ٹیسٹ کے لیے specimen لیا، اندر جگر پر کچھ دھبے تھے جو یہ ثابت کر رہے تھے کہ cell division تیزی سے ہو رہی ہے اور کینسر ہوگیا۔ اس سے پہلے اس کا امکان نہیں تھا۔ ڈاکٹرز نے تجویز کیا کہ پہلے ان کی کیمو تھراپی[chemo therapy] ہوگی اور پھر اس کے بعد جو حصہ تکلیف دے رہا ہے اس کو نکالا جائے گا۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ آپ کو پتہ ہے کہ جب کیموتھراپی ہوتی ہے تو اس کے انسان پر کیا اثرات ہوتے ہیں؟ کہتی ہیں کہ جی ہاں! اتنا تکلیف دِہ عمل ہے کہ انسان اس کے بعد ایک دو دن تو بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوتا، پھر انسان آہستہ آہستہ بہت کمزور ہو جاتا ہے اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے کہ جب اس کے سارے بال اُڑ جاتے ہیں، سر کے بھنوؤں کے، سارے جسم کے اور انسان کو بہت اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں کہ اس علاج کے بعد صحت مل جائے گی؟ کہنے لگیں کہ ڈاکٹرز کوئی گارنٹی نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ آپ پھر اتنی تکلیف کیوں برداشت کرنے پر تیار ہیں؟ کہنے لگیں: اس لیے کہ ڈاکٹر نے کہا ہے اور میرے لیے یہی مناسب ہے، میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں اس ہدایت اور رہنمائی کو قبول کر

لوں۔

تو دیکھیں کہ ایک انسان کو اگر سو فیصد فائدے کی امید نہ بھی ہو اور اس کو یہ گمان ہو کہ 50 % فائدہ شاید ہو جائے یا اس سے بھی کم تو اس کے لیے وہ اپنی بھنویں بھی دینے کو تیار ہے، اپنے سر کے بال بھی دینے کے لیے تیار ہے، پلکیں دینے کے لیے تیار ہے، اپنے جسم کی قوتیں دینے کے لیے تیار ہے اور دوسری طرف دیکھیں کہ ایک انسان کے بارے میں ربّ العزت نے جب یہ تجزیہ سامنے رکھا کہ ااس کے اندر دو بیماریاں پائی جاتی ہیں، دو کمزوریاں ہیں اس کے اندر: ایک تو یہ کہ اس میں عزم نہیں ہے، وہ ارادے کا کمزور ہے اور دوسرا یہ کہ وہ بھول جاتا ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ پتہ چلا کہ انسان پر شیطان حملہ آور ہوسکتا ہے، اگر اس کو ہمیشہ کی زندگی کا لالچ دیا جائے تو وہ متاثر ہوسکتا ہے۔ وہ کمزور ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہدایات بھیجیں کہ دیکھو! اب یہ تو تمہارے مسائل ہیں، ان کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اندر کی ان کمزوریوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر آپ علاج کرانے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں اور وہ آپ کو نسخہ دے تو آپ کیا کریں گے؟ اگر تو آپ صاحبِ فہم ہیں اور پڑھ سکتے ہیں تو پڑھیں گے ورنہ ڈاکٹر سے پوچھیں گے کہ آپ بتادیں کہ ہم نے اس کو کیسے استعمال کرنا ہے؟ پھر آپ میڈیکل سٹور سے اس دوا کو خریدیں گے، اسے استعمال کریں گے۔ ہر صاحبِ شعور انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ کیوں؟ ۔۔۔۔ اس لیے کہ انسان صحت چاہتا ہے، وہ بیمار رہنا نہیں چاہتا، اس کو پتہ چل چکا ہے کہ میری یہ بیماری ہے اور اس کا یہ حل ہے۔ ہر صاحبِ فہم انسان کو جب یہ پتہ چل جاتا ہے تو پھر وہ اس کا علاج کرنا چاہتا ہے اور جب علاج کرتا ہے تو صحت یاب بھی ہوجاتا ہے۔

کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مستقل علاج کرنا پڑتا ہے۔ بھول جانا اور

ارادے کا کمزور ہونا بھی ایسی ہی بیماریاں ہیں۔انسان کے اندر یہ کمزوریاں تو رہیں گی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ ختم ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے ٹیسٹ کر کے بھی دکھا دیا کہ ایسا ہو گا۔پھر ان کے ساتھ ساتھ لالچ کی بیماری بھی انسان کو لاحق ہے اور ایک دشمن بھی ساتھ لگا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ دیکھو، میں تو تم پر مہربان ہوں، میں تمہاری رہنمائی کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی[123]

''جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا اور نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔''

یعنی اب وہ راستہ نہیں بھولے گا،

وہ گمراہ نہیں ہوگا۔

اب وہ پھسلے گا نہیں۔

اب وہ ڈگمگائے گا نہیں۔

اُس سے راستہ نہیں چھوٹے گا۔

اور نہ وہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔

یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا پہلے سے فیصلہ کر رکھا تھا، اسی فیصلے کے تحت حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ زمین پر آئے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ جنت کی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی بہت مشقت والی زندگی ہے۔سوچیں اگر آپ جنت میں ہوتے تو وہ زندگی اچھی تھی یا یہ دنیا کی زندگی؟ جنت میں بڑھاپا کبھی نہیں آنا، وہاں کسی نے بیمار نہیں ہونا، وہاں کسی سے بری بات بھی نہیں سننی، وہاں جو چاہیں وہ

ملے، کوئی مشقت نہیں تو آپ یہ سوچیے کہ حضرت آدم علیہ السلام وہاں اچھے رہ رہے تھے یا یہاں اچھی زندگی گزاری؟ وہاں زیادہ اچھی زندگی تھی تو زمین پر آ کر مشقت برداشت کرنی پڑی اور وہ صرف انھوں نے ہی برداشت نہیں کی بلکہ ساری نسلِ انسانی یہ مشقت برداشت کر رہی ہے، انسان شیطان کے بہکاوے میں آ کر دنیا میں بھٹک سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں رہتے ہوئے انسان بدبختی میں مبتلا ہو سکتا ہے تو اللہ رب العزت نے یہ فرمایا ہے کہ اگر اس ہدایت کا دامن تھام لو گے، اگر تم میری رہنمائی کے سائے میں آ جاؤ گے جیسے حضرت آدم علیہ السلام آئے تھے تو پھر تمہارے لیے دو خوشخبریاں ہیں:

پہلی خوشخبری کیا ہے؟

فَلاَ يَضِلُّ "کہ کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔"

اور دوسری کیا ہے؟

وَلَا يَشْقٰى[123] "بدبختی نہیں ہو گی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاحبِ فہم انسان کے لیے یہ بات سمجھنا کافی ہے کہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی رہنمائی ہے، الہامی کلام ہے، اللہ ربّ العزت کی کتاب ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات سامنے رکھ دی۔ فرمایا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى[124] **قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا**[125]**قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ**

تُنسٰی[126]

''اور جو میرے 'ذکر' (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا میں زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: 'پروردگار! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: 'ہاں، اسی طرح تُو ہماری آیات کو جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تُو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح سے آج تُو بھلایا جا رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے بارے میں پہلی بات ہم پر واضح کی تھی کہ جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا، وہ نہ بھٹکے گا اور نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔

اب دوسری بات سامنے رکھی گئی اور وہ ہے اتباع کے مقابلے میں اعراض۔ اتباع اور اعراض میں فرق دیکھنا بہت ضروری ہے۔

اتباع کیا ہے؟ کسی چیز کے پیچھے چلنا، پیروی کرنا، اگر کوئی آگے چل رہا ہے تو پیچھے چلنے والا بالکل اسی طرح چلے گا جس طرح سے آگے والا چل رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آگے رکھنا ہے کیونکہ اتباع اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ربّ العزت نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [الاحزاب:21]

''تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''

تو بہترین نمونہ سامنے رکھنا ہے اور اس کے پیچھے چلنا ہے۔ سارے رسول علیہم السلام اللہ کے پیغام کو لے کر آئے اور ان کی امتوں نے انہی کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش

کی لیکن وہ صرف اتباع کرنے والے نہیں تھے، ان میں اعراض کرنے والے بھی شامل تھے، اللہ تعالیٰ نے دونوں کی حقیقت کھول کر سامنے رکھ دی۔

اعراض کا مطلب ہے: منہ موڑنا۔ فرض کریں کہ آپ جلتے ہوئے کوئلے کو گلاب کے پھول کا نام دے دیں کہ یہ پھول ہے تو کیا وہ جلتا ہوا کوئلہ جلائے گا نہیں؟ سُرخ تو کوئلہ بھی ہے اور پھول بھی تو کیا پھول اور کوئلہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں: اپنے اثرات کے اعتبار سے، اپنے مزاج کے اعتبار سے؟۔۔۔ نہیں۔ اسی طرح آپ اپنے گھر میں زہر کی بوتل پر شہد کا لیبل لگا کر نہیں رکھ سکتے کیونکہ زہر کے اثرات سے آپ بچنا چاہتے ہیں اور زہر پر کسی اور چیز کا لیبل لگنے سے وہ شہد نہیں بن جائے گا۔

ایسے ہی انسان کا معاملہ ہے۔ اگر ہم قرآن سے منہ موڑنے والے اپنے رویے پر قرآن کی اتباع کرنے والے کا لیبل لگانا چاہیں تو اس سے ہماری کیفیت تو نہیں بدلے گی؟ اللہ تعالیٰ نے نہ تو ہماری شکل کو دیکھنا ہے، نہ ہمارے مال کو دیکھنا ہے اور نہ ہمارے دوسرے معاملات کو دیکھنا ہے، اس نے تو ہماری نیت کو دیکھنا ہے کہ ہم نے کس نیت کے ساتھ، کیسے خلوص کے ساتھ کون سا کام کیا؟ اسی کے مطابق ہمیں اجر ملنا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں قربانی کے بارے میں ربّ العزت فرماتے ہیں:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ [الحج:37]

''اللہ تعالیٰ کو تو قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اس کو تو دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

بعض اوقات ظاہری معاملہ ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہوتا ہے لیکن اندر سے نیت خالص نہیں ہوتی، اس کا مطلب ہے کہ ہم ظاہری دھوکے میں مبتلا ہیں کہ قرآن سے منہ موڑنے

والے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن کے سائے میں زندگی گزارنے والے ہیں۔ زندگی میں ہم قرآن سے کتنا اعراض کررہے ہیں؟ اس کو ہم خود بھی پرکھ سکتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے کہ ہمارے لیے مشکل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا [الجمعه:5]

''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔''

سو اپنا جائزہ لینا ہے کہ میں اتباع کرنے والوں کے زمرے میں ہوں یا منہ پھیرنے والوں کے زمرے میں؟ کیونکہ معاملہ ہر ایک کا اپنا ہے، میدانِ حشر میں جو کچھ ہمارے ساتھ بیتنے والی ہے اس میں نہ ماں نے کام آنا ہے، نہ باپ نے، نہ شوہر نے، نہ بچوں نے، نہ معاشرے کے دوسرے افراد نے، نہ کسی بزرگ نے، کسی ولی نے اور نہ ہی کسی نبی نے، ہر ایک کے کام اس کے اپنے اعمال آنے والے ہیں۔ اس لیے

اگر اپنی زندگی کے ساتھ دلچسپی ہے۔

اگر آئندہ آنے والی زندگی پر یقین ہے۔

اگر اس آنے والی زندگی کو پرسکون بنانا چاہتے ہیں۔

اگر لوٹ کر اسی جنت میں جانا چاہتے ہیں۔

تو پھر ہمیں آج ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔

ہماری یہ پہلی نشست فقط اس حوالے سے ہے کہ

اتباع یا اعراض؟

قرآن کے سائے میں چلنا ہے یا اس سے اعراض کرنا ہے؟

فیصلہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہوگا۔

تو ربّ العزت نے جو اگلی بات فرمائی:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ   ''جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا''۔

اللہ تعالیٰ نے اعراض کرنے والوں کے بارے میں کیا کہا؟

جو قرآن سے منہ موڑتے ہیں، یعنی نہ تو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں، نہ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں، بس صرف برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا شفا حاصل کرنا چاہتے ہیں یا دنیا کا کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن کے آنے کا جو مقصد تھا وہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ   ''جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔''

تو پیروی کرنے کے لیے تو انسان کو عقل، سمجھ اور شعور چاہیے اور پھر اس ہدایت کے مطابق اسے اپنی زندگی میں وہ کام کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف جو رویہ ہے اس کو بھی دیکھتے ہیں، ربّ العزت فرماتے ہیں:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا

''جس نے میرے ذکر سے منہ موڑا، اس کے لیے دنیا کی زندگی تنگ ہوگی۔''

ذکر سے مراد نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کوئی اس سے منہ موڑے گا میں اس کے دنیاوی معاملات خراب کر دوں گا۔ اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ قرآن کے ساتھ اس کا کیسا تعلق ہے تو پھر اسے اپنے دنیاوی معاملات کو دیکھنا چاہیے۔

دنیا کی زندگی کے تنگ ہونے کی ہزاروں صورتیں ہیں، اگر صرف انسان کی ذاتی زندگی کو دیکھیں تو وہ بے چین ہوگا، اس کی زندگی میں بے اطمینانی ہوگی، گھر کے اندر دیکھیں تو آپس کے تعلقات میں اختلاف ہوگا، رزق میں تنگی ہوگی، ایسی بیماریاں کہ اچانک پتہ ہی نہ چلے کہ کیا معاملات ہو رہے ہیں لیکن ربّ العزت فرماتے ہیں کہ میں تنگی لے کر آؤں گا۔

یہاں ایک بات توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تنگی آتی ہے وہ بھی رحمت ہے۔ رحمت کیوں ہے؟ اس میں ربّ کی کیا حکمت ہے؟ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ بندہ تنگ ہو کر میری طرف رجوع کر لے، دوبارہ میری طرف رخ کر لے۔

اسی طرح قرآن سے اس اعراض کو اگر ہم ایک اجتماعی ماحول کے اندر دیکھنا چاہیں تو فرقہ بندی دکھائی دیتی ہے، اتنے لاتعداد فرقے ہیں کہ آپ اگر گننا چاہیں تو یہ بھی شاید مشکل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا دوسری اقوامِ عالم پر کسی قسم کا کوئی رعب ہی نہیں۔ آج اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی ایک ارب سے زائد آبادی ہے، تقریباً 54 یا 55 ممالک ہیں، پھر سب سے زیادہ وسائل انہی کے پاس ہیں لیکن پوری دنیا کے مسلمانوں کے پاس ایک فیصلہ کرنے کا اختیار بھی نہیں ہے، مغلوب ہیں، مفتوح ہیں، کوئی حملہ نہ بھی کرے تب بھی اپنی پالیسی ہی منواتا ہے تو کیا دنیا کی زندگی تنگ نہیں ہوگئی؟

یہ تنگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے، سب کچھ موجود ہو، محنتیں بھی ہو رہی ہوں، صلاحیتیں بھی لگ رہی ہوں اور معیشت [Economy] پھر بھی بیٹھتی چلی جائے۔ کرپشن جہاں کہیں بھی ہوتی ہے چاہے رشوت سے ہو، سُود سے ہو یا کسی اور چیز سے پھر کوئی انسان پابندی عائد کر ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں پچھلے دو سال میں پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں کس قدر اضافہ ہوا۔ کیا روک سکتے ہیں؟ ابھی بھی امکان ہے کہ یہ کم از کم 75 روپے لٹر تک جائے گا۔ یہ ہمارے اعمال ہیں کیونکہ ربّ العزت نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ

''تم منہ تو موڑو، میں دنیا کی زندگی بھی تنگ کر دوں گا۔''

اور ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا کی قوموں نے اسلام کے خلاف ایکا کر لیا ہے، یعنی خالصتاً اب دین کو زندگی سے نکالا جا رہا ہے، اس تنگی کو تب محسوس کیا جائے گا جب نسلوں کے اندر ذرّہ برابر بھی اپنے دین سے دلچسپی نہیں رہ جائے گی کیونکہ والدین گھر میں کتنا سکھاتے ہیں اس کلام کو، یہ آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا؟ یہ تنگیاں، یہ فیصلے انسان نہیں کرتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہوتا ہے کہ جو قوم بھی منہ موڑے گی اس سے پھر وہ سارے مواقع چھین لیے جائیں گے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کر سکیں۔

تو یہاں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے اندر خیر کی طلب نہیں دیکھتے، اپنی طرف اس کا رجوع نہیں دیکھتے، قرآن کی طرف اس کو ملتفت ہوتے نہیں دیکھتے تو پھر اللہ تعالیٰ اس قرآن کے راستے کو ہی اس کے لیے مشکل بنا دیتے ہیں، پھر اس راستے پر چلنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

خان پور میں میری ایک خاتون سے ملاقات ہوئی جو کسی آفیسر کی بیوی تھیں۔ بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ کہنے لگیں کہ میں بہت تکلیف میں ہوں، قرآن پڑھنا میرے لیے انتہائی مشکل ہے، جب میں قرآن اٹھاتی ہوں، اتنی جمائیاں آتی ہیں کہ مجھے لگتا ہے کہ میرا منہ پھٹ جائے گا، آنکھوں سے پانی بہتا ہے اور میرے حالات کافی خراب ہو جاتے ہیں۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں لیکن پڑھ نہیں پاتی۔ میں نے انھیں کہا کہ آپ دو کام کریں:

ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کثرت سے کریں، استغفار کریں اور

دوسری بات یہ کہ آپ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کثرت سے پڑھیں۔

کچھ عرصے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ میں نے فہمِ قرآن

کورس میں داخلہ لے لیا ہے۔میں نے پوچھا:اب کیا صورتحال ہے؟ کہنے لگیں:الحمدللہ، اب میں پڑھتی ہوں تو میرے اعصاب اُس طرح سے نہیں ٹوٹتے، میرے لیے اب اتنی مشکل نہیں ہے لیکن ابھی بھی مسئلہ ہے سہی۔کچھ عرصے بعد میری پھر ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ اب میں 25ویں پارے پر ہوں۔

تو دیکھیے کہ جس وقت انسان اپنے رب سے بھاگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے واپسی کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں لیکن اگر انسان کے اندر سچی طلب پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پھر اُسے راستہ دے دیتے ہیں۔

اور یہ جو راستوں کا مسدود ہونا ہے، یعنی ایک انسان جب یہ کہتا ہے کہ

مجھے مشکل بہت لگتا ہے،

میرے پاس ٹائم نہیں ہے،

سستی غالب آجاتی ہے،

عمل کرنا مشکل لگتا ہے،

پھر پڑھنے کا کیا فائدہ؟

یہ سارے جو معاملات ہیں یہ انسان کا محض ذاتی فیصلہ نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکاوٹ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا ہے کہ دل کے اندر طلب نہیں ہے۔جب سچی طلب نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ پھر موقع نہیں دیتے۔اُس نے تو راستہ کھلا رکھا ہوا ہے لیکن جس کا دل نہ چاہے اس کو اللہ تعالیٰ پھر موقع نہیں دیتے۔مثال کے طور پر کسی کا دل نہیں چاہتا کہ وہ برا کام کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھلائی کا راستہ آسان کر دیتے ہیں، برائی کا راستہ اور مشکل بنا دیتے ہیں، انسان پھر بھی برائی کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر اُسے مدد مل جاتی ہے۔اگلی بات جو ربّ العزت نے فرمائی وہ یہ کہ

وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی[124] قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَ قَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا[125]

''اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔وہ کہے گا:اے میرے ربّ! تُو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ میں تو دنیا میں دیکھنے والا تھا۔''

یہ ہے ہمیشہ کی زندگی کا معاملہ۔جس نے دنیا میں اندھا بنا رہنا چاہا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اندھا اٹھائیں گے۔آنکھیں رکھنے کے باوجود دنیا میں انسان کیسے اندھا بنا رہتا ہے؟

یہ بات توجہ طلب ہے۔مثلاً آپ آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو جہان روشن لگتا ہے،رنگ دیکھیں،ربّ کی بنائی اس کائنات کو دیکھیں،اپنی پسند کی چیزوں کو دیکھیں۔۔۔دیکھ تو ہم سکتے ہیں لیکن ایک انسان اگر اس دنیا میں رہتے ہوئے

اپنی حقیقت کو ہی نہ دیکھے۔

اپنی زندگی کے پروگرام کو ہی نہ دیکھے۔

اپنی رہنمائی کے راستے کو ہی نہ دیکھے۔

تو پھر آنکھیں رکھتے ہوئے بھی وہ اندھا ہے۔

مثال کے طور پر ایک ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تو پتہ چلا کہ وہ راستے میں سو گیا تھا، سونے کی وجہ سے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور کئی جانیں اللہ کے پاس پہنچ گئیں تو انسان گاڑی چلاتے ہوئے سوئے تو ایکسیڈنٹ تو ہوتا ہے،اسی طرح وہ اگر قدرت ہونے کے باوجود راستہ نہ دیکھے تو پھر ظاہر ہے کہ نتیجہ تو سامنے آتا ہی ہے۔

دنیا کی زندگی میں ہم جن آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں وہ آنکھیں قرآن ہیں،

اللہ کی طرف سے بھیجی گئی رہنمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری ذات پر دو کرم کیے ہیں:

1۔ اس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا۔

2۔ اپنی آخری کتاب قرآنِ پاک کی صورت میں بھیجی۔

یہ ہماری دو آنکھیں ہیں جن سے ہم نے دنیا کی زندگی کی حقیقت کو دیکھنا ہے اور جس کی وجہ سے ہم راستہ دیکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت میں قرآن کو پڑھنا چاہتی ہوں، قرآن میرے سامنے ہے، میری نیت صاف ہے (الحمدللہ) لیکن نظر کی کمزوری کی وجہ سے مجھ سے پڑھا نہیں جاتا، پھر میں کیا کرتی ہوں؟ عینک لگا لیتی ہوں، اس طرح مجھے لفظ بالکل صاف دکھائی دینے لگ جاتے ہیں اور پھر میں قرآن کو پڑھ لیتی ہوں۔

ایسے ہی دنیا کی زندگی میں انسان کی آنکھوں پر کچھ پردے پڑے رہتے ہیں، خواہشات کے، غفلت کے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس آنکھیں تو موجود تھیں لیکن تم نے دیکھا ہی کب ہے؟ تم نے تو اندھا بنا رہنا پسند کیا تو آج کے دن ہم تم سے تمہاری وہ آنکھیں ہی واپس لے لینا چاہتے ہیں۔

ذرا تصور کر کے دیکھیے۔ ایک چیز کو محض واقعے کے طور پر پڑھنا فرق بات ہے اور اپنے اوپر اس کو محسوس کرنا فرق بات ہے۔ سوچ کر دیکھیں:

اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہیں اور آنکھ دیکھتی نہیں ہے۔

دنیا میں جب کسی کو کم نظر آنے لگتا ہے تو اس کی کیفیت کتنی عجیب ہو جاتی ہے۔ میری ایک سٹوڈنٹ نے مجھے بتایا کہ اچانک بیٹھے بیٹھے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تو مجھے یوں لگا کہ مجھے قے آنے لگی ہے۔ جب انسان کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر ایسے ہی اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ کہتی ہیں کہ جب میں نے دنیا کو تاریک محسوس کیا تو مجھے لگا کہ جیسے زندگی کا اختتام ہو گیا ہو۔

تو جو ابدی زندگی ہے کیا اس میں اندھا بن کر رہنا ہے؟

آج اگر اپنے لیے اس نور، اس روشنی، اس قرآن کو نہ لیا تو پھر کل کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ

وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی[124] قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا[125]

''ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: اے میرے مالک ![مجھے پالنے والے! میری زندگی کے سارے انتظامات کرنے والے! وہ تمام انسان بھی جو اپنے ربّ کے ساتھ ایک شعوری تعلق نہیں رکھتے وہ وہاں ضرور کہیں گے: اے میرے ربّ! اے میرے پالنے والے پالنہار، پروردگار!] تُو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟''

میری آنکھیں کیوں مجھ سے واپس لے لیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ج وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی[126]

''اسی طرح تو ہماری آیات کو جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا، اسی طرح آج تو بھی بھلایا جا رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں گے کہ کیا تمہارے پاس میرا قرآن نہیں آیا تھا؟ تم نے اسے بھلا دیا۔ بھلایا کیسے؟۔۔۔

اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔

اسے اپنی زندگی کے لیے ضروری ہی نہیں خیال کیا۔

اس کو کتابِ زندگی ہی نہیں بنایا۔

تم نے اسے بھلا دیا تو دیکھو، آج کے دن تم بھلائے جاتے ہو اور آپ دیکھیں کہ کتنا بڑا عذاب ہے، کتنی نا قابل برداشت بات ہے کہ ربّ انسان کو بھول جائے۔

دنیا کی زندگی میں ربّ نہیں بھلاتا، وہ رزق بھی دیتا ہے، آکسیجن بھی دیتا ہے، انسان کو زندگی گزارنے کے سارے سامان دیتا ہے لیکن جب ربّ بھول جائے گا تو انسان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ قرآنِ حکیم میں آتا ہے کہ اس وقت انسان دوزخ کے داروغوں سے یہ فریادیں کریں گے کہ اپنے ربّ سے کہہ دو کہ اب تو معاف کر دے، اب تو معاف کر دے، اب تو ہمیں چھوڑ دے۔ اپنے مالک سے کہہ دو۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ربّ سنے گا جو نہیں۔

ذرا تصور کیجیے۔ کسی کو اپنے باپ سے سب سے زیادہ محبت ہے، کسی کو اپنی ماں سے، کسی کو بہن بھائیوں سے، کسی کو شوہر سے، جو بھی ہستی سب سے زیادہ عزیز ہے اگر وہ بات کرنا چھوڑ دے، دیکھنا بھی چھوڑ دے تو انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ شوہر اور بیوی کے تعلق کو دیکھیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے آپس میں باتیں نہ ہوں، ایک دوسرے کو دیکھنا بھی نہ چاہیں، پھر کیا ہوتا ہے؟ اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں، طلاقیں تک ہو جاتی ہیں کہ ایسی زندگی گزارنے کا کیا فائدہ؟ زیادہ اچھا ہے کہ ہم الگ ہی ہو جائیں۔

دنیا کی زندگی میں تو انسان فیصلے کر سکتا ہے لیکن وہاں میدانِ حشر میں کیا کرے گا؟ وہاں تو اللہ تعالیٰ، مالکِ کائنات بھلا دے گا، پھر کبھی توجہ نہیں ہوگی۔ وہاں ان سے کہا جائے گا:

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج

”اسی طرح تو ہماری آیات کو جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا۔“

تم نے انھیں ضروری خیال ہی نہیں کیا۔

تم نے کہا کہ ابھی وقت نہیں ہے۔

تم نے کہا ابھی ہم پڑھ رہے ہیں۔

تم نے کہا ابھی ہمارے بچے چھوٹے ہیں۔

تم نے کہا اب ہم نوکری [job] کر رہے ہیں۔

پوری زندگی میں وقت ہی نہ آیا جب تم میری کتاب کے ساتھ تعلق جوڑتے؟

اس سوال کو گھر بیٹھ کر پانچ بار دہرا کر دیکھیے گا، دل کیا کہتا ہے؟

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى[126]

”اسی طرح تو ہماری آیات کو جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا، اسی طرح آج تو بھی بھلایا جا رہا ہے۔“

اگر میں نے قرآن کو بھلایا، اگر میں نے اسے زندگی کے پروگرام میں شامل نہ کیا تو میرا ربّ مجھے بھول جائے گا، پھر میں کبھی کامیاب نہ ہوسکوں گی، ہمیشہ کے لیے آگ میرا مقدر بن جائے گی؟ پھر کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، کوئی فریاد سننے والا نہیں ہوگا۔ انسان فریادیں کرے گا، اس کا گلا رو رو کر خشک ہو جائے گا، چہرہ اس کا بھُن جائے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے چہرے کی ساری کھال جھلس جائے گی جیسے بکرے کی سری کو آگ پر بھونتے ہیں تو اس کی اوپر کی ساری کھال اتر جاتی ہے اور جبڑے باہر نکل آتے ہیں؟ تو

جب ایک بار کھال جل جائے گی تو پھر دوسری بار دے دی جائے گی، یہ سلسلہ تو مسلسل ہوتا چلا جائے گا، کبھی ختم نہیں ہوگا تو اس وقت جب کوئی فریاد نہیں سنے گا تو یہ کتنی غم کی کیفیت ہو گی؟

پھر آج ہم غم کا سودا کیوں کریں؟

آج ہم رسوائی کا سودا کیوں کریں؟

آج ہم اپنے نقصان کا سودا کیوں کریں؟

آج تو زندگی ہے۔

آج تو ہمیں پتہ ہے۔

آج تو ہم فیصلہ کر سکتے ہیں۔

پھر ہم کیوں خود کو اس پوزیشن پر لا کر کھڑا کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہماری طرف دیکھے بھی نہیں، وہ ہمیں بھول جائے، اُس وقت کوئی نہیں ہوگا جو ہماری طرف توجہ کرے، ایک ربّ کا آسرا ہوتا ہے انسان کو وہ بھی نہیں ہوگا، وہ بھی نہیں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنی پچھلی زندگی کی طرف دیکھو، یہ تمہارے اعمال ہیں جو تمہارے کام آرہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى[127]

"اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے ربّ کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے (کبھی ختم ہونے والا نہیں)۔"

اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ دیکھو پہلی قومیں ہلاک ہوئیں، جب طوفانِ نوح آیا تھا تو حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو بھی نہیں بچا پائے تھے۔اسے اتنا ضرور کہا تھا کہ بیٹا آجاؤ! کشتی میں سوار ہو جاؤ! مگر اس نے کہا:

سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ

''میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچالے گا۔''

تب نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ[ھود:43]

''آج کے دن کوئی بچانے والا نہیں ہے۔''

اس کے بعد ایک لہر آئی پہاڑ سے بھی اونچی اور بہا کر ساتھ لے گئی۔سب کچھ ختم۔

انسان اپنی زندگی میں ہمیشہ یہی سوچتا ہے کہ کوئی بڑی شخصیت، کوئی نبی، کوئی ولی، کوئی فرد ایسا ہوگا جو مجھے بچالے گا لیکن تاریخ کیا سبق دیتی ہے؟ کوئی بچانے والا نہیں۔قومِ نوح پر جو طوفان آیا تھا، آج اس کی یادگاریں دنیا کی ہر زبان کے لٹریچر میں موجود ہیں، ایک بات ضرور پتہ چلتی ہے کہ یہ طوفان بہت شدید تھا اور ساری انسانیت اس سے باخبر ہے کہ کوئی نافرمان فرد نہیں بچا تھا۔ پھر آخر سبق کیوں نہیں لیتے؟

جب اللہ کا عذاب آتا ہے اور جب لوگ اس کی گرفت میں آتے ہیں پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جیسے قومِ ہود پر اللہ کا عذاب آیا تھا، ایک ایک پتھر نشان زدہ تھا، جس کو لگا وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، پھر اُٹھا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی نشانیاں دکھائیں؟

پچھلی قوموں میں بھی نشانیاں ہیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت بہت قریب آ گیا۔جیسے راولہ کوٹ میں آنے والے زلزلے میں 64 دنوں کے بعد نقشہ بی بی ملبے کے تلے

سے ملی ہیں۔کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والا واقعہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات آتے ہیں تو پھر مہلت ختم ہو جاتی ہے۔مثلاً قومِ موسیٰ علیہ السلام پر معجزات آئے تھے، پھر اللہ ربّ العزت نے جب مہلت ختم کی تو انہیں بندر بنا دیا، کیا ایسا نہیں ہوا؟ وہ لوگ تو یہودیوں میں سے تھے جن کو بندر بنا دیا گیا لیکن باقی قوموں کے حالات کو بھی دیکھیے ،اللہ تعالیٰ نے معجزات آنے کے بعد پھر لمبے عرصے تک مہلت نہیں دی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ

”پھر کیا ان لوگوں کو(تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں۔“

جو ہم سے زیادہ اچھی بستیاں تھیں، جن کے پاس زیادہ قوتیں تھیں، مال بھی زیادہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین پر بسنے کا موقع نہیں دیا۔ربّ العزت فرماتے ہیں کہ کیا تم اس سے سبق نہیں لیتے ہو؟ پھر فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی[128]

”درحقیقت اس میں سے بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں۔“

یعنی عقل والوں کے لیے تو یہ نشانیاں کافی ہیں لیکن جو عقل سے کام نہ لینے والے ہوں

وہ ہمیشہ اپنی مستیوں میں گم رہتے ہیں کیونکہ انھیں اپنے انجام کا احساس نہیں ہوتا، مثال کے طور پر ایک بچہ ہے، اگر آپ اسے سانپوں میں بھی بٹھا دیں گے تو اس کو محسوس ہی نہیں ہوگا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ابھی اس کی عقل میں یہ بات آئی ہی نہیں ہے، اس کا شعور اتنا پختہ نہیں ہوا کہ مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے تو جن کو شعور نہیں ہوتا وہ تو نقصان اٹھاتے ہی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعور ہونے کے باوجود انسان سبق کیوں نہیں لیتا؟۔۔۔۔اس لیے کہ اس کی اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی، وہ یہ بھول جاتا ہے کہ میں آیا کہاں سے تھا اور میں نے جانا کہاں ہے؟

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ مائنڈ سیٹنگ [mind setting] کا ہے، ہم نے اپنے ذہن میں ایسی باتیں بٹھالی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم خود کو تسلی اور دلاسہ دیتے رہتے ہیں۔ اس ذہنی تبدیلی کو، اس اندر کے پروگرام کو تبدیل کرنے کی بے انتہا ضرورت ہے۔ جیسا کہ اکثر ہی یہ بات کہی جاتی ہے چاہے بڑے سے بڑا گناہ کرلیں کہ چلو کوئی بات نہیں اللہ غفور الرّحیم ہے، وہ تو معاف کرنے والا ہے، تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ دیکھو تم نے لوٹ کر تو میرے ہی پاس آنا ہے اور یہ سوچو کہ اگر میرے ذکر سے منہ موڑا تو دنیا کی زندگی تنگ ہوگی اور جب میرے پاس لوٹو گے تو تمھیں ایسے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا کہ جس میں سب سے پہلے تمہاری آنکھیں جائیں گی، میں تمہیں اندھا کردوں گا اور جیسے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت میں پیش ہوں گے ان کے لیے اللہ ربّ العزت نے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے، ان کے لیے زقوم تیار ہے، کھولتا ہوا پانی، کچ لہو اور پیپ۔

تو انسان کس بات پر مطمئن ہوتا ہے؟

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بنیادی طور پر انسان ان امور پر سوچنا ہی نہیں چاہتا تو

دنیا میں اگر ہم آنکھیں بند کر کے اور حقیقت سے منہ موڑ کر چلتے بھی رہے تو بہر حال انجام تو سامنے آنا ہی ہے۔ایک خاتون نے مجھ سے کہا کہ میں کسی بھی انجام کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی، بس مجھے سوچنا اچھا نہیں لگتا، میں نے تو طے کر لیا ہے کہ سوچنا نہیں ہے۔

لیکن یاد رکھیے گا کہ انسان کو جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کا نہ سوچنا ہے،غور نہ کرنا ہے، بے شعوری کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔مسئلہ جب بھی حل ہوتا ہے عقل کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔جیسے آپ دیکھیں کہ روم تباہ ہو گیا تو تباہی کے وقت کھنڈرات پر بیٹھ کر اس قوم نے یہ سوچا تھا کہ روم تو تباہ ہو گیا،ٹھیک ہے ہم لٹ گئے تباہ ہو گئے،ہم نے نقصان اٹھالیا،ہم نے تسلیم کر لیا لیکن اب ہم نے نئے سرے سے اس کو تعمیر کرنا ہے،لہٰذا وہ اکٹھے ہوتے تھے،مل بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے،حل نکالتے تھے اور پھر کچھ ہی عرصے بعد روم وہاں پر دوبارہ تعمیر ہو گیا۔انسان کا جو ذہن ہے، یہ سوچتا ہے، سمجھتا ہے، جائزہ لیتا ہے، حالات کا تجزیہ کرتا ہے، پھر حل نکلتا ہے۔

اس وقت ہماری تعلیم کے پیچھے جو تصورات قائم ہیں،جن کو ہم مغربی نقطۂ نظر [western point of view] کہتے ہیں اور جو اسلامی تعلیم کے پیچھے تصورات ہیں،ان کا ایک چھوٹا سا تجزیہ[comparison] آپ کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں:

مثلاً انسان کے بارے میں موجودہ تعلیمی نظام کی بیک پر جو آئیڈیا ہے وہ یہ کہ انسان پیدائشی گنہگار ہے جبکہ اس بارے میں ربّانی علم ہمیں یہ تصور دیتا ہے کہ انسان معصوم پیدا ہوا ہے،ربّ العزت نے فرمایا:

فِطْرَتَ اللہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا [الروم:30]

’’اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا‘‘۔

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

''ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' [مسلم]

یعنی ماحول کی وجہ سے انسان خراب ہوتے ہیں، پیدائشی گنہگار نہیں ہوتے۔

تو دیکھ لیجیے کہ جو علم ہمیں ربّ نے دیا وہ مفید ہے یا وہ علوم ہمارے حق میں مفید ہیں جو اس وقت ہم حاصل کر رہے ہیں۔ کس قدر غور طلب بات ہے کہ دنیا میں ہم جس چیز پر وقت لگا رہے ہیں اس نے ہمیں کیا دینا ہے اور جس پر نہیں لگا رہے اس کی وجہ سے ہمیں کیا نقصان ہو رہا ہے؟ ایک انسان جب یہ کہتا ہے کہ میں پیدائشی گنہگار ہوں تو اس کے اثرات اس کی زندگی پر کیسے مرتب ہوتے ہیں؟ اس نظریے کا دفاع کرنے کے لیے اس کو باقاعدہ فلسفے گھڑنے پڑتے ہیں۔

مثلاً یہ طے کیا گیا کہ پادری کے سامنے جا کر اعترافِ گناہ [confess] کرو تو تم معاف کر دیے جاؤ گے۔ پھر یہ نظریہ تراشا گیا کہ آپ پیدائشی گنہگار تو ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کے کفارے کے لیے (نعوذ باللہ) اپنا بیٹا بھیج دیا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنھوں نے اپنی زندگی قربان کر دی اور اب کسی کو کوئی فرق پڑنے والا نہیں، چاہے گناہ کریں یا اچھے کام کریں، بہر حال وہاں کی جنت تو اپنی ہی ہے تو اس تصور کے تحت انسان دنیا میں کوئی اچھا کام کرنے کا پابند ہی نہیں ہے۔

اسی طرح سے دوسری جو بات انسانوں کے ذہنوں میں ہے وہ یہ کہ انسان مجبورِ محض ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے فطری طور پر کرتا ہے، یہ اس کی جبلت ہے، اس کے اندر جیسا مادہ موجود ہے بس وہ ویسا کر دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ گناہ کرتا ہے اور کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر [Islamic point

of view] کا سورہ الکہف کی اس آیت سے پتہ لگتا ہے، ربّ العزت فرماتے ہیں:

فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ [الکہف:29]

''جس کا جی چاہے وہ مان لے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کردے۔''

یعنی یہ انسان کے کلّی اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو ربّ کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو اس کے راستے کو چھوڑ دے۔اس بارے میں وہ اختیار رکھتا ہے، مجبورِ محض نہیں ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس دنیا میں رہنے کا فیصلہ کردیا ہے، کچھ چیزیں طے شدہ ہیں مثلاً یہ کہ

وہ کس گھرانے میں پیدا ہوگا؟

کس شکل وصورت کا ہوگا؟

اس کی عمر کتنی ہوگی؟

اس نے کب ربّ کے پاس واپس لوٹ جانا ہے؟

ان معاملات میں تو انسان مجبور ہے لیکن دنیا کی زندگی میں تو وہ مجبور نہیں ہے، وہ چاہے تو ربّ کا راستہ اختیار کرسکتا ہے اور نہ چاہے تو بہانے تراش سکتا ہے اور عذر تراشے بغیر بھی ربّ کے راستے کو چھوڑ سکتا ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مغربی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کو دنیا کی زندگی میں صرف دنیا کی کامیابی چاہیے اور ایسا تبھی ہوسکتا ہے جب اس کے پاس ڈھیر ساری دولت ہو۔جس انسان کے ذہن میں یہ بات آگئی تو وہ سدا دولت کے پیچھے بھاگے گا، اس کی زندگی میں پھر ربّ کے لیے کوئی وقت نہیں ہوگا، پھر اس کی زندگی میں اپنے بارے میں سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں جو کامیابی کا تصور دیا ہے وہ انسان کی

مختلف قسم کی Activities ہیں یعنی اس نے مال بھی کمانا ہے، اس نے معاشرے کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک بھی کرنا ہے، اس نے اپنے اخلاق کو بھی درست رکھنا ہے، اس نے اپنے ربّ کے ساتھ بھی اچھا تعلق رکھنا ہے، اس کی عادات واطوار بھی بہتر ہونی چاہئیں، اس سے کسی کو کوئی دکھ تکلیف بھی نہیں پہنچنی چاہیے، تب ہی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیاب ہوسکتا ہے۔

ماضی میں دیکھیں تو بہت سی شخصیات ایسی ہیں جو دنیا میں کامیاب ہوئیں مثلاً فرعون، ہامان، قارون وغیرہ۔ قارون پر لوگوں کو بڑا رشک آتا تھا کہ اس کے خزانے کی چابیاں تین سو خچروں پر لادی جاتی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے وہیں زمین کے اندر دھنسا دیا، جب وہ دھنس گیا تو لوگوں نے کہا کہ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ مال نہیں دیا تھا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں صرف مال ہی کامیابی کا ذریعہ بننے والا نہیں ہے۔

آپ آخرت کو چھوڑ دیں صرف دنیا کو دیکھیں تو یہاں بھی انسان مال کے بَل بُوتے پر کامیاب نہیں ہوسکتا، فقط مال نہیں چاہیے، اس کے لیے اور بھی اسباب ووسائل چاہیے ہوتے ہیں لیکن جس نے یہ سمجھ لیا کہ مال ہی میرے لیے ضروری ہے تو اس کی ساری کوششوں کا محور ومرکز پھر مال ہی ہوگا۔ مثلاً غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری ساری دنیاوی تعلیم فکرِ معاش ہی سکھاتی ہے، job oriented اور buisness oriented ہے کہ علم حاصل کرنا ہے، جاب حاصل کرنے کے لیے، مال کمانے کے لیے۔ یہ علم زندگی کے لیے نہیں ہے، آخرت بچانے کے لیے نہیں ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ جو حیات بخش علم ہمیں دیتے ہیں اس کے بارے میں کیسے وضاحت کردی کہ یہ تمہیں کامیابی کے مقام تک پہنچانے والا ہے۔ اسی کی وجہ سے تم اپنے کھوئے ہوئے مقام تک پہنچ سکتے ہو، اپنی جنت تک پہنچ سکتے ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

''علم جنت کے راستوں کا مینار ہے۔'' [جامع بیان العلم وفضلہ]

جیسے ہوائی جہاز سے سفر کریں تو دور سے ایک مینار [tower] نظر آتا ہے جو Indicatio n دیتا ہے اور اس کی وجہ سے جہاز وہاں پر لینڈ کر سکتا ہے تو اسی طرح سے جنت کے راستے میں اللہ ربّ العزت کا دیا ہوا علم ہمارے کام آتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا اور اس کی وجہ سے تم اتنا آگے جا سکتے ہو۔

کل میری چار سال کی بیٹی مجھے کہہ رہی تھی کہ میں نے پاپا کو بہت سمجھایا ہے۔ میں نے کہا: آپ نے کیا سمجھایا ہے؟ کہنے لگی کہ میں نے انھیں کہا ہے کہ جنت جانا ہے تو بہت ساری نیکیاں کرنے کی ضرورت پڑے گی تو بہت ساری نیکیاں کرنی ہیں اور ہمارے پاس نیکیاں کم ہیں۔

اللہ ربّ العزت بھی تو ہمیں یہی سمجھاتے ہیں کہ تمھیں اس راستے پر چلنے کے لیے بہت ساری نیکیوں کی ضرورت ہے، یہ نیکیاں کرو گے تو جنت تک پہنچ جاؤ گے لیکن انسان کہتا ہے کہ میرے پاس وقت جو نہیں ہے میں کیا کروں؟ وقت وہ انسان نکال سکتا ہے جو یہ سمجھ لیتا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری چیز جنت ہے، جس کو اس دنیا میں رہتے ہوئے محسوس کرنا ہے اور جہاں پر جانے کی شدید تمنا دل کے اندر پالنی ہے اور جنت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے جو دوسرا تصور دیا یعنی جہنم کا تو اس کا خوف انسان کو اس سے بچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کو سامنے رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے، مقصد کو سامنے رکھے بغیر انسان ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔

یاد رکھیے گا! ہماری منزلِ مقصود جنت ہے۔ اگر جنت تک نہ پہنچ سکے تو پھر دوسرا مقام پھر جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کا جو پروگرام دیا، اپنی کتاب دی، وہ اس لیے کہ ہم اپنی اس زندگی کو بہتر بنانے کے لیے آج فیصلہ کریں۔

اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے مقصد کا صحیح شعور عطا فرمائے اور ہمیں ان لوگوں میں شامل کر دے جو اس کی کتاب کی طرف توجہ کرتے ہیں، جو اس کے سائے میں رہنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں اعراض کرنے والا، منہ موڑنے والا نہ بنائے اور ہمیں اس برے انجام سے بچا لے اور دنیا و آخرت میں اس کی نظرِ کرم ہم پر رہے۔

[آمین]

[سی ڈی سے تدوین، تعلیم القرآن 2006ء]